The Lighthouse Journal of Literature & Linguistics, Vol. 02, Winter 2023, pp. 34-40

اقبال اور مسئلہ قومیت

ڈاکٹر شہزاد خان[1]

ABSTRACT

Modern Nationalism and Nation-state Theory and practices as compared to Islamic Universal ideology are the major aspects of criticism of Iqbal's thoughts. Iqbal analyzes critically the philosophy of the Western Nation-state and unveils its horrors for humanity. He advocates for the Universal ideology of the Islamic political and social system for humans as it offers equality, justice and honour to all human beings irrespective of their colour, cast, language or blood relation.

Keywords: *Nationalism, Islamic Universal Ideology, Iqbal's thoughts, Western Nation State*

تعارف

قوم یا قومیت کی اصطلاح اتنی قدیم ہے جتنی انسانیت کی تاریخ ۔بشریت کی طویل ترین تاریخ میں انسان نے جب تمدن کی طرف سفر شروع کیا تو اکثر مشترک اور مفادات کی خاطر انسانوں نے گروہوں میں مل کر ایک اجتماعی سماج یعنی اکائی کی صورت اختیار کی پھر ایک طویل عرصہ کسی خطہ زمین میں گزار کر ایک قوم یا قبیلے کی شکل اختیار کرنے لگے۔ دنیا میں ابتدائی قومی ہیئتوں کی شکلیں ہمیں قدیم مصری اقوام ،اہل بابل ، اکادی ،اسیری ،سمیری اقوام اور یونانی شہری ریاستوں کی صورت میں ملتی ہیں ۔ اسی طرح قدیم عرب اقوام مثلا عاد ،ثمود وغیرہ، قدیم ایرانی اور اسرائیلی بھی اسی زمرے میں آتے ہیں ، یہ بات اہم ہے کہ وحدانی مذاہب خصوصا اسلام اور کسی حد تک عیسائیت نے بھی انسانوں کی اجتماعی ہیت،رنگ ،نسل ،زبان ،وغیرہ سے ہٹ کر نظریئے کی بنیاد پر تعمیر کی ۔ اس کے علاوہ دنیا میں جتنے بھی ادارے اور اقوام گزری ہیں یا اب بن رہے ہیں ان کی چند مشترک خصوصیات ہیں ۔ ان اشتراکات میں وطن،زبان ،رنگ ،معاشی اغراض اور کوئی مخصوص سیاسی نظام وغیرہ شامل ہیں ۔ ان مشترکات نےایک طرف انسانی سماج کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا لیکن دوسری طرف جب یہ عناصر عصبیتوں کی شکل میں ڈھل گئے تو انسانی گروہوں کے درمیان فساد اور بگاڑ بھی انہی کی وجہ سے پیدا ہوئے ۔جدید تہذیب کے وجود میں آنے سے قبل وطن دوستی اور حب قوم ایک معصوم اور بے ضرر جزبہ رہا ہے ۔سیاسی قومیت اور سیاسی وطن پرستی جدید دور ہی کی پیداوار ہے ۔ اس سے پہلے اس بنیاد پر انسانیت کی اتنی توہین اور تذلیل نہیں کی گئی۔

قوم یا قومیت اپنے اصل ہیت کے اعتبار سے قدیم ترین اصطلاح ہے۔ معلوم تر تاریخ میں انسان نے جب تمدن کی طرف سفر شروع کیا تو مشترک اغراض اور مفاد کی خاطر بہت سارے افراد نے مل کر ایک اکائی یعنی انسانی سماج کی صورت اختیار کی اور پھر ایک خاص جغرافیائی خطہ میں ایک معتدبہ زمانہ گذارنے کے بعد اکثر ایک قوم کی شکل میں ڈھل گئے۔ قدیم یونان کے شہری ریاستیں(City State)، قدیم مصری قومیں، بابل اور اس کے نواح میں پھلنے والے اکادی، اسیری اور سمیری اقوام، قدیم ایرانی اور اسرائیلی سب اقوام ہی کے زمرے میں آتی ہیں اور قومی عصبیت نے ہی ان کے کثرت میں وحدت پیداکی۔ وحدانی نظریات کے حامِل مذاہب خصوصاًَ اسلام اور کِسی حد تک قرون وسطیٰ کی عیسائیت کے تعمیر کردہ انسانی سماج اور اداروں کے سِوا دنیا میں جتنے

[1] **پی ایچ ڈی ، شعبہ لسانیات و ادبیات (اُردو)**
گورنمنٹ ڈگری کالج یکہ غُنڈ ضلع مہمند
Corresponding Author's Email: shehzad14445@gmail.com

Manuscript Received: Sep 29, 2023
Manuscript Accepted: Dec 20, 2023

بھی اقوام گذرے ہیں یا اب بن رہے ہیں ان سب کی چند مشترک بنیادیں ہیں۔ ان بنیادوں میں وطن کا اشتراک، زبان کا اشتراک، اشتراک رنگ، معاشی اغراض کا اشتراک، مشترک نظام زندگی وغیرہ شامِل ہیں۔

تاریخ کے طویل دورانیے کے دوران قوموں کی تشکیل میں اگر چہ مذکورہ بالا مخصوص عصبیتیں بنیادی کردار ادا کرتی چلی آرہی ہیں لیکن عملی طور پر تاریخ انسانی میں جدید تہذیب سے پہلے وطن دوستی یا قوم دوستی ایک معصوم اور بے ضرر جذبہ رہا ہے۔ اس دور سے پہلے وطن پرستی کے جذبے کی بنیاد پر عالم انسانی کے درمیان نہ کوئی خاص جھگڑا فساد برپا ہوا اور نہ ہی انسانیت کی تذلیل ہوئی۔

جدیدقوم پرستی دراصل یورپ میں سترھویں صدی عیسوی کے دوران نو دولتیوں، بادشاہوں اور چرچ کے درمیان ایک طویل کشمکش اور جنگ وجدل کے بعد حاصل ہوئی اور جس کی بنیاد پر جدید قومی ریاستوں(Nation States) کا ابتدائی ہیولیٰ تیار ہوا۔ جے۔ایل۔برئیرلے اس دور کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> "It (Reformation) declared the determination of the civil authority to be supreme in its own territory; and it resulted in the decisive defeat of the last rival to the emerging unified nation state...The church was so shaken that as a political force it could no longer compete with the state. The Peace of Westphalia which brought to an end in 1648, The Great Thirty years war of Religion marked the acceptance of the new political order in Europe".1

1۔ترجمہ: نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں نے متعلقہ علاقوں کے اندر عوامی بالادستی کا اعلان کیا اور نتیجتاً آخری مدمقابل (یعنی چرچ) کی فیصلہ کن شکست کے ساتھ متحدہ قومی ریاستیں وجود میں آگئیں۔ چرچ کا ادارہ اتنا کھوکھلاہو گیا کہ یہ مزید ریاست سے مسابقت کا قابل نہ رہا۔ ۱۶۴۸ءمیں عظیم تیس سالہ مذہبی جنگ کے خاتمے پرویسٹ فیلیا کے امن عہد نامے نے یورپ میں نئے سیاسی نظام کی قبولیت پر مہر لگادی۔

اگر چہ اس کے بعد مغرب میں شہنشائیت، جمہوریت، سماجی اصلاح کاروں آزادی اظہار اور دستور نوازوں کے درمیان ایک طویل بحث مباحثہ اور نزاع چلتا رہا لیکن وطن پرستی کو اس کے انتہائی درجے پر قبولیت عام حاصل ہوگئی۔ یورپ کے مدبرین نے وطن پرستی اور قوم پرستی کے بدترین نتائج سے بے پرواہ ہوکراس "حسن محو خواب (Sleeping Beauty) "کی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے حالانکہ بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ یہ حسن کی دیوی نہیں تھی بلکہ ایک خون خوار اژدھا (Monster) تھا جس نے انسانیت کی ہڈیاں چبائیں۔ اس دوران یورپ کے بعض دانشوروں نے اہل یورپ کو نسلی تفاخر اور گروہ بندیوں پر مبنی قومیتوں کی تشکیل کے بدترین نتائج سے خبردار کیا۔ ان میں جان ژاک روسو، ایمانویل کانٹ، جیریمی بینتھم، رچرڈ کابڈن، جان برائٹ اور فرانچسکو بومے کے نام اہم ہیں۔ لیکن وہ بھی اس شیطانی تعصب کو روک نہ سکے۔ رنگ، نسل، زبان اور مشترک تاریخ جیسے انسان دشمن ہتھیاروں کے ساتھ فادر لینڈ اور مدر لینڈ جیسے تصورات نے انسانیت پر آخری ضرب لگائی اور جن کی کوکھ سے سیاسی نیشنلزم، الٹرانیشلزم، نیشنل سوشلزم اور فاشزم جیسے انسانیت کو ذلیل کرنے والے نظریات نکل کر پھیلنے لگے۔ فادر لینڈ اور مدر لینڈ کو ایک بت بنا کر اس کی پوجا کی جانے لگی۔ اس بت کی پوجا عرب کے نسلی تفاخر، یورپ کے نسلی امتیازات (Xenophobia) ، جاپانی اور چینی وطنی جذبے

شاونزم (Chauvinism)سے کسِی طرح کم نہ تھی۔ یہ بت اگر ماضی میں پتھر اور گارے سے بنا کر پوجے گئے تو زمانہ جدید کے ترقی یافتہ انسان نے دماغ میں اس کے لیے بت خانہ بنا کر سجالیا:

؎ اس دور میں مے اور ہے جام اورہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف وستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

(بانگ درا، ص ۱۶۰)

عالمی وحدانی مذاہب نے اس انسانیت کش جذبے کو بڑی حد تک قابو کیا لیکن بعض مذاہب بھی اس رنگ میں رنگے گئے۔ یہودیوں کا ''ملک موعود (Promised Land)'' اسی رنگ سے سجا ہوا ہے۔ سٹیون گراسبی اس بابت لکھتے ہیں:

> "The description of land as mother or father is a recognition of its generative power. In antiquity it took the form of the acknowledgement as the god or gods of the land. Islamic civilization on the other hand has historically been relatively resistant to the development of images of territorially extensive motherland and fatherlands, especially compared to Judeo-Christian civilization in which that recognition has been sustained by the images of the land of ancient Israel as one of milk and honey." 5

5- ترجمہ:ملک کو ماں باپ جیسی حیثیت دینا اس جذبے کی حر کی طاقت پر دلالت کرتی ہے۔زمانہ قدیم میں ملک کو دیوتا یا دیوتاوں کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ دوسری طرف صرف اسلامی تہذیب نے تاریخی لحاظ سے مدر لینڈ اور فادر لینڈ کی شبیہوں(اور تصورات)کی وسیع تناظرمیں مزاحمت کی بہ نسبت یہودی مسیحی مشترک تہذیب کے تحت پروان چڑھنے والے وطنی شبیہوں کے وہی قدیم اسرائیلی تصور جس میں وہ ملک کو دودھ اور شہد سے تشبیہ دیتے ہیں۔

جدید وطنی نظریات نے تمام اقوام کے افراد کی اس نہج پر فکری تربیت جاری رکھی ہے کہ وہ اپنی اقوام کے افراد کو دوسرے انسانوں سے بہتر اور برتر جانیں۔ امریکی یہی سمجھے کہ دنیا پر حکومت کرنا ان کاحق ہے، ''جرمنی سب سے اوپر'' جرمنوں کا قومی ترانہ ہو،اطالویوں کا فخریہ نعرہ یہ ہوا کہ ''اطالیہ ہی مذہب ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ جب اس جذبے نے جنگ کی صورت اختیار کی اور پہلی عالمی جنگ نے نوع انسانی کو آگ کے شعلوں میں دھکیلا تو عالمی ضمیر جاگنے لگا۔ لیکن ایک دفعہ پھر انسانیت کی بدقسمتی غالب آگئی اور یورپ کے شاطروں نے جمعیت آدم کے بجائے جمعیت اقوام کا راگ الاپا اور ''لیگ آف نیشنز'' کے ہتھیار سے کمزور اقوام کے استحصال اور اُسی عصبیت جاہلیت کے لیے راہیں ہموار کیں۔

یہ اقبال کا زمانہ تھا اور انہوں نے بروقت نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ پوری انسانیت کو اس فریب سے باخبر کیا:

؎ اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

(ضرب کلیم، ص ۵۷)

اس طرح اہل اسلام کی آفاقیت اور انسان دوستی کو فرنگ کی چال بازیوں سے بچانے کے لیے انہیں ایک الگ پلیٹ فارم پر مجتمع ہونے کا مشورہ بھی دیتا ہے:

؎ دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

(ضرب کلیم، ص ۱۴۷)

جدید دور میں جتنے بھی لادین ازم ہیں وہ سب انسان کی آفاقی سوچ کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ اس نکتے کو اقبال نے'' تشکیل جدید الہٰیات اسلامیہ'' میں بہترین طریقےسے واضح کیا ہے:

"بہرحال یہ وطنیت ہو یا لادین اشتراکیت دونوں مجبور ہیں کہ بحالت مجبوری انسانی روابط کی دنیا میں تطابق کی جو صورت ہے اس کے پیش نظر ہر کسِی کو نفرت، بدگمانی اور غم وغصے پر اکسائیں، حالانکہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سر چشمے تک پہنچ سکے۔ جب تک انسان کو اپنے آغاز وانجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا جس میں باہم دگر مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے۔"(6)

۱۹۰۵ءسے پہلے اقبال بھی روایتی شعرا کی طرح اورخصوصاَ انگریزی شاعری کے اثرات کی وجہ سے مروجہ وطن پرستی کے حامی نظر آتے ہیں لیکن اُس زمانے کے عالمی سیاست کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد ان کی رائے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ ۱۹۰۵ءسے ۱۹۰۸ءتک کا زمانہ اقبال نے بہ سلسلہ تعلیم یورپ میں گذارا۔ رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ غیر رسمی مطالعہ اور اپنی ذات کی بازیافت کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ ستمبر ۱۹۱۲ءمیں اپنے ایک تحریر کردہ خط میں زمانہ قیام یورپ میں اسی ذہنی انقلاب کا تذکرہ کرتے ہیں:

"اس زمانے میں سب سے ذیادہ بڑا دشمن، اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیازو ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب وہوا نے مجھے مسلمان کردیا۔" (7)

اسی قیام فرنگ کے دوران افکار اقبال کے زاویے وطن پرستی سے ملت کی طرف مڑ گئے۔ وہ اپنے افکار کے لیے ایک الگ انجمن بنانے میں لگ گئے۔ وہ انجمن جس کا اقبال کے زمانے میں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ چار سو عالم میں یا تو وہ وطنیت کا ڈنکا بج رہا تھا اور یا اشتراکیت کا۔ ان سے الگ کوئی نعرہ کیسے مقبول ہو سکتا تھا اور ایسے ہم نفس کہاں تھے جن کی تائید سے وہ تمام دنیا سے الگ تھلگ ایک راہ اپناتے:

ے یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے جو زیر چرخ کہن نہیں ہے

(بانگ درا، ص ۱۳۶)

ایسے حالات میں افکار اقبال کو قبولیت حاصل ہونا ایک کرشمے سے کم نہیں۔ یہ کرشمہ ان کی فن کا مرہون منت ہے۔ اگر فنکار اقبال کا خون جگر اس میں شامِل نہ ہوتا تو شاید یہ محض ایک واعظانہ نعرہ ثابت ہوتا۔ جب ہر طرف وطن پرستی کے نغمے گائے جارہے تھے وہاں ایک بندہ ایسا بھی نمودار ہوا جس نے وطن ہی سے انکار کردیا اور اس نعرہ مستانہ کی طرف سب کو متوجہ کیا:

ے کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

(بانگ درا، ص ۱۳۶)

اقبال کی فنی اور فکری زندگی میں مارچ ۱۹۰۷ ؁ء کی غزل سے ان کے فکری ارتقاءکے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس موڑ (Point Turning)کے بعد وہ وطنیت اور قوم پرستی کی صرف رد نہیں کرتے بلکہ مغربی طرزِ زندگی اور تہذیب کے مقابلے میں ایک متبادل نظامِ زندگی کے اصول بھی پیش کرتے ہیں۔ اب وہ علاقائیت کو چھوڑ کر ترانہ ہندی اور نیا شوالہ کی بجائے ترانہ ملی پیش کرتا ہے۔ اب ان کے ہاں وطنیت بحیثیت ایک سیاسی تصور کے کسِی طرح بھی ایک بت سے کم نہیں۔ اس بت کو اب وہ خاک میں ملانا چاہتا ہے:

ے یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کا شانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملادے

(بانگ درا، ص ۱۶۰)

یہاں یہ بات اہم ہے کہ وطن یا جائے پیدائش سے محبت کرنا ایک فطری جذبہ ہے اور ہر کوئی فطری طور پر اس جذبے کا اظہار کرتا ہے۔ اقبال بھی اس جذبے کی قدر کرتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ وطن یا قوم کی بنیاد پر اہلِ وطن کو ترجیح دی جائے اور غیر اہلِ وطن سے نفرت کی جائے۔ انسانیت کے لیے جو جذبہ نقصان دِہ اور ضرر رساں ہے وہ وطنیت کا سیاسی تصور ہے جو خالِص مغرب کا پیدا کردہ اور پر وردہ ہے۔ اس سیاسی تصور نے ایک طرف انسانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنایا تو دوسری طرف اس نے مذہب، روحانیات اور اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا:

ے اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے

تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(بانگ درا، ص ۱۶۰)

چونکہ جدید دور کے مسلمان بھی اس مغربی قوم پرستی کو بلاچون وچرا قبول کر رہے تھے اور مسلمانوں میں ایسا کوئی رہنما بھی نظر نہیں آرہاتھا جو اسلام کے صحیح نظریہ قومیت کو پیش کرسکتے اور مسلمانوں کے سواد اعظم کو یہ باور کرادیتے کہ مروجہ جدید وطنیت کے نظریات اسلامی نظریہ قومیت کی ضِد ہیں۔ مسلمانوں کے اس علمی فقدان کو اقبال بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور مسلمانوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی اصل سے آگاہ ہوں اور اپنی اساس پر غور کریں:

؎ بڑھ کہ خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے

(بال جبریل، ص ۶۴)

جدید دور کا یہ معرکہ دین و وطن مرد مومن کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کا مرد مومن آفاقیت کے لحاظ سے اس

کا ئنات پر بھی بھاری ہے۔ اس کی آفاقیت اس کائنات میں آسانی سے سما نہیں سکتی۔ وہ زمانے کے ہر قید سے آزاد ہے:

؎ نہ چینی وعربی وہ نہ رومی وشامی
سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

(بال جبریل، ص ۶۶)

حوالہ جات:

J.L Brierley, the law of Nations, Oxford University Press, 1963, PP: 05 .1

2- حب وطن،حب قوم یا حب نسل کی ایک مبالغہ آمیز شکل جس کی وجہ سےایک فرد یا قوم دوسرے اقوام سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کیہ ایک شکل خود ساختہ جنسی تفوق کی ہے۔ یعنی مردوں کے ہاں وہ احساس جس کی بنیاد پر وہ خود کو عورتوں سے فائق سمجھتے ہیں۔

3-زینو فوبیا اس مخصوص خوف اور نفرت کاق نام ہے جو عموماً غیر ملکیوں اور دوسری نسلوں سے تعلق رکھنے انسانوں سے کیا جاتا ہے۔ بنادی طور پر یہ ایک تعصب ہے جو متعصب لوگ انسانی نسلی امتیازات کی بنیاد پر روا رکھتے ہیں ۔

4 - ا رض موعودض یا ارض میعاد جس کو دودھ اور شہد کی زمین بھی کہتے ہیں ۔ وہی زمین جس کو طناخ یا بائبل کے قدیم نسخے کے مطابق خدا نے حضرت ابراہیم ؑ سے اس کا وعدہ کیا اور پھر انہیں اور انکی اولاد کو عطا کیا ۔ اصطلاح جدید میں ارض المیعاد سے مراد

یہودیوں کے لیے اس وطن کا حصول اور نجات دونوں مراد لیے جاتے ہیں ۔ باب الخروج کے مطابق یہ ارض المیعاد دریائے نیل اور دریائے فرات کے درمیان تمام علاقہ شامل ہے۔ (باب خراج ؛ ۳۱،۲۳) ارض موعود کا تصور صیہونیت کا بنیادی نصب العین ہے۔ صیہونیت (Zionism) ارض موعود کی بنیادوں پر ایک وسیع یہودی ریاست قائیم کرنے کی تحریک ہے۔

5 - Steven Grosby, Nationalism, Oxford University Press, PP 45

6- پروفیسر غلام حسین ذوالفقار، اقبال ایک مطالعہ، ص ۶۴، بحوالہ اقبال نامہ حصہ دوم بزم اقبال لاہور

7۔ ایضاً، ص ۵۷